

مسلمانوں کا ذوقِ کتاب داری

بمبئی میں اور لاہور میں

جناب پرو فیسر محمد سلیم صاحب

پنجاب پبلک لائبریری لاہور کا صد سالہ یادگاری جلسہ ۲۹ جنوری ۱۹۸۵ء کو حبس
ڈاکٹر جاوید اقبال کی صدارت میں قائد اعظم لائبریری باغ جناح لاہور کے سماعت خانہ میں
منعقد ہوا تھا۔ اس میں یہ مقالہ پڑھا گیا تھا۔

طبعی لحاظ سے بھی عرب ایک ریگستان تھا اور علوم و فنون کی گرم بازاری کے لحاظ سے بھی بیخبر
تھا۔ جب اسلام آیا تو اس ریگستان میں علوم و فنون کی فصل بہار لہلہا اُٹھی۔ ہر گوشہ میں درس و تدریس
کی بساط جھی ہوئی تھی۔ ہر مسجد قال اللہ اور قال الرسول کے زمرہ جہان فرائد کے نعروں سے گونج رہی تھی۔
علوم و فنون کی ایجاد اور اختراع میں مسلمانوں نے کسی دوسری قوم کا بارِ احسان نہیں اٹھایا۔ کسی کے سامنے
انہوں نے زانوئے تلمذ طے نہیں کیا۔ تمام علوم و فنون اُن کے اپنے طبع زاد ہیں۔ ان کے اپنے ذہن
کی اختراع ہیں۔

ناخواندہ عرب کے ناخواندہ نبی پر پہلی وحی جو نازل ہوئی وہ پڑھنے سے متعلق ہے:

اقراء باسم ربك الذي خلق۔ اور دوسری وحی جو نازل ہوئی وہ لکھنے سے متعلق ہے:

والقلم وما يسطرون۔ اس لیے مسلمانوں میں پڑھنے اور لکھنے کی تحریک قرآن مجید سے جاری
ہوئی۔ اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہِ صفا پر دارِ ارقم بن ابی ارقم میں ایک مخفی مدرسہ

جاری فرمادیا۔ جہاں نئے نئے اسلام لانے والوں کو آپ تعلیم دیتے تھے۔ ہجرت کے بعد جب مدینہ منورہ میں آزاد فضا بيسر آئی تو مسجدِ نبوی کی تعمیر کے ساتھ آپ نے صفحہ کا مدرسہ بھی شروع کیا۔ یہ اسلام کا پہلا باقاعدہ مدرسہ تھا۔ جہاں سے مسجدِ نبویہ مدرسہ کا دائمی رشتہ قائم ہو گیا۔ اس کے بعد جہاں جہاں مسلمانوں کے قدم پہنچے، جہاں جہاں انہوں نے مسجدیں تعمیر کیں وہاں مدارس بھی قائم ہو گئے۔ کتبِ نویسی کو مزید تقویت حضرت عمر بن عبدالعزیز (۱۰۱-۹۹ھ) کے فرمان سے حاصل ہوئی۔ آپ نے پوری مملکت میں اہل علم کو ترغیب دی کہ وہ احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جمع کریں۔ پہلے مسلمانوں نے احادیث کے مجموعے تیار کیے۔ پھر ان کی تصحیح اور ترتیب میں مشغول ہو گئے۔ صدیوں محنت اور جہاں فشانی سے مسلمان علماء نے حدیث کی چھان بھٹک کا کام مکمل کیا۔ سقوطِ بغداد (۶۵۸ھ) تک سب سے اعلیٰ اور سب سے اشرف علم، علمِ حدیث تھا۔

کتبِ نویسی کی تحریک کو کاغذ سازی کی صنعت سے غیر معمولی تقویت پہنچی۔ کاشغر کے چینی قیدیوں سے (۱۰۵ھ) مسلمانوں نے یہ صنعت حاصل کی اور پھر ساری دنیا میں اس کو عام کر دیا۔ اس کے بعد کتب خانوں کا وجود میں آجانا لازمی امر تھا۔ مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ معاویہ بن یزید (۶۴ھ) نے اسلام میں پہلا کتب خانہ قائم کیا تھا۔ معمر نے بیان کیا ہے کہ امام زہری کی کتب اونٹوں پر لاد کر خلیفہ ولید ثانی کے کتب خانہ میں لائی گئی تھیں اس کے بعد کتبِ نویسی اور کتب سازی کو فروغ حاصل ہوا۔

دمشق، بغداد اور قاہرہ عالمِ اسلام میں علوم و فنون کے مراکز تھے۔ مساجد میں درس و تدریس کی گرم بازاری تھی۔ شوقین طلباء دور دراز علاقوں سے سفر کر کے ان شہروں میں پہنچتے تھے اور فاضل اساتذہ سے علم حاصل کرتے تھے۔ علمی سرگرمیاں بھی شباب پر تھیں۔ علماء تصنیف و تالیف میں مشغول تھے۔ کاتب اور دراز قاتبوں کی نقلِ نویسی میں منہمک رہتے تھے۔ بیت الحکمت اور خزانہ الکتاب کے نام سے اعلیٰ پیمانہ پر کتب خانے قائم ہو رہے تھے۔

کتبِ تحمیں خط میں مشغول تھے۔ عہدِ عباسی کا مشہور خطاط ابن مقلد (۳۲۴ھ) نے ایک شاہی فرمان لکھ کر قیصرِ روم کو بھیجا تھا۔ قیصر خط کی رعنائی اور خوب صورتی سے بے حد متاثر ہوا اور اس نے اس کو خزانہ میں محفوظ کر لیا۔ علم الکتاب از ابو جیان توجیدی ۲۱۲ھ۔ اردو ترجمہ ص ۱۵۔ طبع لاہور (۱۹۶۶ء) تزئین اور آرائش کتب کا فن اپنے عروج پر تھا۔ اوراقِ کتب پر نقش و نگار بنانے میں آبِ زہر

استعمال کیا جاتا تھا۔ بغداد میں تانادیوں نے اور صلیبیوں نے غرناطہ، اندلس میں مسلمانوں کے کتب خانے تذر آتش کیے۔ اس وقت کتا میں جل رہی تھیں اور سونا پگھل پگھل کر زمین پر بہ رہا تھا۔ البدایہ والنہایہ حافظ ابن کثیر

علوم و فنون کی یہ ساری سرگرمیاں اور ترمین کتب کی یہ اعلیٰ روایتیں سارے عالم اسلام میں تقریباً یکساں فروغ پا رہی تھیں۔ ایک ملک کے لوگ دوسرے ملک کے لوگوں سے مسابقت کرتے تھے۔ ابن حزم اندلسی نے ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ فضل المتعاربہ علی المشاركة۔ یعنی اہل مغرب — اندلس اور راکش وغیرہ کی علمی نصیبت مشارقہ پر یعنی شام، ایران، خراسان پر۔

برصغیر ہندوستان کا خطہ دولتِ غزنیہ کے زمانے میں عالم اسلام کا حصہ بنا ہے۔ ایران اور خراسان سے آمدہ علماء اور فضلاء نے علمی سرگرمیاں اور تصنیفی روایات برصغیر ہندوستان میں منتقل کر دیں۔ پھر یہاں بھی بہار آگئی۔ مساجد، مدارس اور خانقاہوں میں وہی علمی سرگرمیاں جاری ہوئیں۔ اہل علم اور اہل ہنر کی فزردانی ہونے لگی۔ جلدی ہی اس خطہ نے ترقی کر لی اور علم کی سرپرستی اور فروغ میں یہ خراسان اور ماوراء النہر کا ہم پلہ ہو گیا، البتہ یہاں کوئی ابن حزم پیدا نہیں ہوا۔ جو اس خطہ کے علماء اور فضلاء کے محاسن اور کارنامے بیان کرتا۔ بلاشبہ یہ خطہ عالم اسلام میں دیر سے شامل ہے، مگر یہ کوئی فروتر حصہ نہیں تھا۔

دولتِ غزنیہ کا بانی سلطان محمود غزنوی خود بھی صاحبِ علم تھا۔ وہ فقہ کی ایک کتاب کا مصنف ہے۔ وہ علم کا شیدائی تھا۔ اس کے دربار سے چار سو علماء و فضلاء اور شعراء و ابنتہ تھے۔ اس نے غزنی میں ایک عالی شان کتب خانہ اور ایک عجائب خانہ قائم کیا تھا۔ (فرشتہ) پٹھان اور بلوچ قبائل میں اسلام کی اشاعت کے لیے اس نے مدارس قائم کیے تھے۔ انگریز مورخین نے اپنی سیاسی چالوں کے پیش نظر اس اولین فاتح کو بدنام کیا ہے۔ ورنہ وہ ہندوؤں پر بھی جہربان تھا۔ پھر مفتوحہ شہر لاہور کا گورنر اس نے اپنے ہندو خادم تلک کو مقرر کر دیا تھا۔ سومنات کی فتح کے موقع پر بھی اس کے ساتھ ہندو فوج تھی۔ قنوج کی فتح کے موقع پر رام آدیہ نے محمود کی شان میں ایک قصیدہ پڑھا تھا جو محمود چتر کے نام سے مشہور ہے۔ محمود نے خوش ہو کر اس کو ایک ہاتھی انعام میں دیا تھا۔ معارف اعظم گڑھ) محمود کا نام اسلامی دنیا کے دوسرے علم دوست اور معارف پرور امرائے ممالک میں عباد

اور خانخانان کے سامنے لیا جاسکتا ہے۔

عربی رسم الخط کی ایک عجیب و غریب خصوصیت یہ رہی ہے کہ جب بھی کوئی نئی اسلامی سلطنت قائم ہوئی اور نیا دارالحکومت بنا تو وہاں نیا خط — طرزِ نگارش — وجود میں آ گیا۔ کوفہ دارالحکومت بنا تو خطِ کوفی وجود میں آیا۔ بغداد دارالحکومت بنا تو وہاں خطِ نسخ ایجاد ہوا۔ اہل خانیوں نے تبریز کو دارالحکومت قرار دیا تو وہاں خطِ تعلیق ایجاد ہوا۔ عثمانیوں نے قسطنطنیہ کو خلافت کا مستقر قرار دیا تو وہاں خطِ دیوان وجود میں آیا۔ تیموریوں نے ہرات کو اپنا دارالحکومت بنایا تو وہاں خطِ نستعلیق وجود میں آیا۔ انہی روایت کے تتبع میں جب اسلامی حکومت کو دہلی میں استیقام حاصل ہوا تو وہاں خطِ بہار وجود میں آیا۔ خطِ بہار ہندوستان میں ایجاد ہوا۔ اور یہاں ہی اس نے فروغ پایا۔

انصاف: ملک طوسی کے بعد عالم اسلام میں مدارس قائم کرنے کا سلسلہ جاری ہو گیا تھا۔ نظامیہ بغداد، نیشاپور وغیرہ — بڑے بڑے مدارس بھی قائم ہوئے جیسے مدرسہ مستنصریہ بغداد جس کی عمارت آج تک موجود ہے۔ لیکن عالم اسلام کا سب سے بڑا مدرسہ ربیع رشیدی (ربیع CAMPUS) تھا جو تبریز کے قریب قائم ہوا تھا۔ اسی کو اہل خانیوں کے وزیر اعظم رشید الدین فضل اللہ نے قائم کیا تھا۔ یہ مدرسہ کیا تھا اہل علم کی ایک بسنی تھی۔ جو کئی سو ایکڑ رقبہ پر محیط تھی۔ جہاں سینکڑوں سقے لکڑ لکڑ سے، نان پز، باورچی، خدمت گزاروں رات مشغول کار رہتے تھے۔ طلباء اور اساتذہ کی یہ اعلیٰ قسم کی بستی تھی۔

ایسا ہی ایک مدرسہ فیروز شاہ تغلق (۱۳۹۰ء) نے دہلی میں قائم کیا تھا۔ یہ ۷۰ ایکڑ پر محیط تھا۔ مدرسہ کی عمارت دو منزلہ تھی۔ گنبد کے اطراف میں رنگ برنگے شیشے لگے ہوئے تھے۔ غروب آفتاب کے وقت عجب خوش نما منظر بن جاتا تھا۔ مدرسہ میں شیرازی قالین بچھے رکھتے تھے۔ خوراکیں میں تیز تر بیڑ مچھلی کا گوشت دیا جاتا تھا۔ اساتذہ کو پان کے بیڑے چاندی کے ورق میں بیٹھے ہوئے دیئے جاتے تھے۔ گرمیوں میں ذائقہ دار شربتوں سے ان کی تواضع کی جاتی تھی۔ اساتذہ شامی جتے پہنتے تھے اور مصری دستار باندھتے تھے۔ مظہر دہلوی نے اس کی مدح میں قصیدے لکھے ہیں۔ ان مدارس میں اساتذہ ہر چیز سے بے نیاز ہو کر مستقل مزاجی سے درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ ان کے شوق اور مستقل مزاجی کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ

ہلاکو خاں کے ہاتھوں اہل بغداد کے سر سے ایک قیامت گزر گئی۔ پالیس دن تک قتل و غارتگری اور آتش زنی ہوتی رہی۔ سب تباہی اور بربادی ختم ہوئی تو ہلاکو خاں اُجڑے اور تباہ حال شہر کے نظارے کے لیے نکلا۔ اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اُس نے دیکھا کہ مدرسہ مستنصریہ میں حسب سابق استاد اور طلبہ موجود ہیں اور درس و تدریس میں مشغول ہیں۔ گویا اس شہر میں کچھ ہوا بھی نہیں۔ (الفخری - صیاطبائی)

اس سے ملتا جلتا واقعہ دہلی میں بھی پیش آیا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں انگریزی فوجیں دہلی پر گولہ باری کر رہی تھیں۔ میاں جی نذیر حسین کی مسجد میں گولے آ کر گر رہے تھے۔ محمد اشرف سندھو لکھتے ہیں۔ اس حالت میں بھی حدیث کا درس برابر جاری تھا۔ میاں جی استقلال کا پہاڑ بنے ہوئے بیٹھے تھے۔ بمصداق آیت کریمہ: **الان اولیاء اللہ لا خوف علیہم ولا هم یحزنون**۔

درس و تدریس کے ساتھ ساتھ یہ علماء تصنیف و تالیف میں بھی وقت صرف کرتے تھے۔ بعض علماء تو مسلسل لکھتے رہتے تھے۔ ابو ریحان البیرونی ۱۰۵۱ء کے متعلق باقوت حموی نے معجم ابلد ^ن میں لکھا ہے۔ ”بیرونی ہمیشہ علم کے حاصل کرنے میں مشغول رہتا تھا۔ قلم کو ہاتھ سے اور آنکھ کو کتاب سے کبھی جدا نہیں کرتا تھا۔ سال میں صرف دو دن ایسے تھے کہ وہ فارغ رہتا تھا۔ وہ نوروز اور مہرجان کے تہوار تھے۔ ان دنوں میں وہ دوست احباب کے لیے کھانا تیار کرتا تھا۔ اس سے ملنے کے لیے آتے تھے۔ اس لیے کہ وہ مجرد تھا۔ اُس نے شادی نہیں کی تھی۔“

ہمارے یہاں بھی ایک ایسے ہی کثیر التصانیف بزرگ مولانا وحید الزمان حیدر آبادی تھے (۱۸۷۰ء) وحید اللغات میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں ”میری عمر اب ۷۰ سال کے قریب ہے، لیکن اللہ کے فضل و کرم سے آنکھ اور ہاتھ کی قوت مثل ایام جوانی ہے۔ ابھی تک کئی میل پیدل لیتا ہوں۔ اور سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ صبح چھ بجے سے شام پانچ بجے تک برابر لکھتا رہتا ہوں اور وہ بھی روزانہ۔ یہاں تک کہ یوم العید کو ناغہ نہیں کرتا۔ بڑے بڑے قومی اور مضبوط جہان چھ گھنٹے کام کرنے کے بعد مہاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ میں گیارہ گھنٹے برابر لکھتا رہتا ہوں۔ ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔ باوجود اس کے کہ غذا میری دو پیسہ بھر چاول اور ایک پیسہ بھر آٹا ہے اور سادہ شوربا اور کسی قدر دودھ ہے۔ دودھ آدھ پاؤں سے زیادہ نہیں دشا ہی ڈبل پیسہ مراد ہے۔“

ایک ایسے ہی کثیر التصانیف بزرگ نواب صدیق حسن خاں نواب بھوپال تھے۔ ان کے شوقِ تصنیف کا اندازہ اس واقعے سے ہوتا ہے کہ وہ جب شادی بیاہ میں شرکت کے لیے جاتے تھے تو اپنا بستہ کتب اور قلمدان ضرور ساتھ لے جاتے تھے۔ کھانے میں عموماً دیر ہو جاتی ہے وہ ایسی حالت میں ایک گوشہ میں بیٹھ کر لکھنا شروع کر دیتے تھے۔

اس دور میں کتابوں کی قدر و منزلت بھی بہت زیادہ ہوتی تھی۔ امرا اور حکمران کتابوں پر بے دریغ روپیہ خرچ کرتے تھے۔ خاص طور پر مصنف کا اولین نسخہ حاصل کرنے کے لیے۔ ابوالفرج اصفہانی (۳۵۶ھ) نے ادب کی مشہور زمانہ کتاب الغانی تصنیف کی۔ اندلس کے خلیفہ الحکم ثانی (۳۶۶ھ) کو اس کا علم ہو گیا۔ اس نے اس کے لیے ایک ہزار دینار (۱۱۰ سرخ) صرف کر کے پہلا نسخہ حاصل کیا۔ ہمارے یہاں محمد شاہ تغلق (۵۲۱ھ) بڑا عالم فاضل بادشاہ گزرا ہے۔ اس کو معلوم ہوا کہ مشہور عالم دین قاضی عضد الدین ایچی کتاب مواقف لکھ رہے ہیں۔ بادشاہ نے مولانا معین الدین عمرانی دہلوی کو ایران ان کی خدمت میں بھیجا کہ وہ ہندوستان تشریف لے آئیں اور مذکورہ کتاب بادشاہ دہلی کے نام منسوب کریں۔ تحفہ تحائف اور انعام اکرام لے کر ہندی سفارت روانہ ہوئی۔ جب شیراز کے بادشاہ ابواسحاق (۴۴۴ھ) کو ہندی سفارت کا علم ہوا وہ قاضی عضد الدین نے جلنے میں مانع ہوا۔ اُس نے قاضی سے کہا میں آپ کی ہر طرح خدمت کرنے کو تیار ہوں یہ میرا تحفہ حاضر ہے۔ میری منکوحہ کے علاوہ جو شے آپ چاہیں لے سکتے ہیں، لیکن شیراز چھوڑ کر نہ جائیں۔ اس کے بعد قاضی نے سفر کا ارادہ ترک کر دیا۔

اہل علم اور اہل فن کی قدر و ثانی کا ایک بھرتہ انگریز واقعہ ایران کے شاہ اسماعیل صفوی سے متعلق ہے۔ ترکوں اور ایرانیوں کے درمیان ایک فیصلہ کن جنگ ۹۲۰ھ میں ہوئی ہے جو جنگ چالدران کے نام سے مشہور ہے۔ جنگ میں جیسا شکست کے آثار نظر آنے لگے تو شاہ اسماعیل صفوی نے نادرہ روزگار خطاط محمود اور نادرہ روزگار مصور بہزاد کو پہاڑوں میں کہیں چھپا دیا تاکہ شکست کی صورت میں عثمانی فوجیں ان دونوں کو قتل نہ کر سکیں۔ دارالسلطنت اصفہان کے مال و متاع سب کے مقابلے میں اُس نے صرف فن کاروں کی حفاظت کی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک ان افراد کی کیا قدر و قیمت تھی۔

اس سے ملتا جلتا واقعہ ہمارے یہاں بھی پیش آیا ہے۔ کھبائت کی جنگ سے واپسی کے موقع پر ایک گروہ تے ہمایوں بادشاہ کے خیمہ پر شبنوں مارا۔ اور سارا مال و متاع لوٹ کر لے گئے۔ اس میں تاریخ تیموری کا وہ نایاب نسخہ بھی تھا۔ جس کو بہزاد نے مصور کیا تھا۔ اس کے لیے ہمایوں نے وہی ڈیرے ڈال دیئے۔ سارے لشکر کو پھیلادیا کہ وہ نسخہ تلاش کر کے لائیں۔ جب تک وہ نسخہ دوبارہ حاصل نہ کر لیا، وہاں سے کوچ کا حکم نہ دیا۔ (اکبر نامہ۔ جلد اول۔ ص ۱۳۶)۔

بصغیر کے شہروں میں لاہور کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ ۴۱۳ھ میں سلطان محمود غزنوی نے اس شہر کو فتح کیا تھا، بعد میں اپنی ہندوستانی سلطنت کا اس کو مرکز بنایا۔ لاہور نے بڑی جلدی ترقی کی۔ حتیٰ کہ اس کو غزنی خورد کہنے لگے۔ یہاں سلطان ابراہیم بن مسعود (۴۵۲-۴۵۰) جب حکمران ہوا۔ جو سال میں دو قرآن اپنے ہاتھ سے لکھتا تھا اور حرمین شریفین بھیج دیتا تھا۔ یہاں باہر سے علماء اور مشائخ آنے شروع ہو گئے۔ مثلاً سید اسمعیل محدث (۴۲۸ھ) سید حسین زنجانی (۴۳۱ھ) ابوالحسن علی بھویری (۴۶۵ھ) علم و فضل کے ساتھ شعروادب کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ ابوالفرج مدنی (۴۹۲ھ)۔ مسعود سعد سلمان (۵۱۰ھ) اس دور کے شعراء ہیں۔

ہندو دور میں کتابیں تاڑ کے پتوں پر یا بھوج پتے پر لکھتے تھے۔ پتوں کے درمیان میں سے ایک دھاگہ گزار کر ان پتوں کو نتھی کر لیتے تھے۔ جب مسلمان یہاں آئے تو اپنے ساتھ عالم اسلام کی علمی روایات اور کتاب سازی کے طریقے بھی لائے۔ مسلمان یہاں کاغذ لائے۔ انہوں نے سمرقندی، کشمیری، مینزن کوٹی (سندھی)، قطنی (روٹی کا)، مختلف اقسام کے کاغذ بنائے۔ مسلمانوں نے یہاں آکر جلد سازی کا فن سکھایا۔ آرائش کتب اور جلد سازی نے اس وقت ایک مستقل فن کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ایک اعلیٰ درجے کی کتاب کی تیاری میں مختلف فن کار حصہ لیتے تھے۔ مثلاً کاتب، مذہب، جدول کش، مجلد، صحاف، زرکوب، لاجورد شو اور کاغذ فروش۔ اس دور کی لاہور میں تیار کی ہوئی بعض کتابیں دنیا کے کتب خانوں میں آج بھی پائی جاتی ہیں۔ ایک کتاب پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔ بہجتہ النفوس والاسرار فی تاریخ معجزۃ المختار اس کا نام ہے۔ اس کا مصنف عبداللہ بن عبد اللہ ہے۔ اس کا کاتب ابو حامد بن ایوب بخاری ہے۔ تاریخ کتابت ۲۸ جمادی الاخریٰ ۴۳۶ھ ہے۔ یہ سلطان مودود بن مسعود غزنوی کا زمانہ ہے۔

لاہور کی پندرہویں صنعت زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی۔ ۶۳۹ھ / ۱۲۴۱ء میں ایک تاناری حملہ آور سے شوالک کی پہاڑیوں کے راستے داخل ہو کر لاہور پر حملہ کر دیا۔ اور اس کو بری طرح تباہ و برباد کر دیا۔ آئندہ ایک صدی تک پھر لاہور کا نام سننے میں نہیں آیا۔ مغل حکمرانوں کے دور میں لاہور کو پھر عروج حاصل ہوا۔ مغل سلطنت میں آگرہ کے بعد یہ دوسرے درجے کا شہر تھا۔ دوبارہ پیشہر علماء و فضلا کا لمجا و ماویٰ بن گیا۔ مغل حکمران خود بھی اہل علم ہوتے تھے۔ لاہور کا پہلا مغل گورنر مرزا قلیچ خان تھا۔ وہ مرزا دانیال کا خسر اور اکبر بادشاہ کا سمدھی تھا۔ اس کا یہ معمول تھا کہ کچھری جلنے سے قبل اڑھائی گھنٹہ تک وہ طلبہ کو گھر پر تعلیم دیتا تھا۔ اس کے پاس ایک بڑا کتب خانہ تھا۔

مغل بادشاہوں کو فنِ خطاطی اور فنِ کتاب سازی سے عشق تھا۔ ہر فن کار کی قدر افزائی ہوتی تھی۔ مغل حکمران صفویوں سے عثمانیوں سے اور انبکوں سے فن کی قدر دانی میں مسابقت کرتے تھے۔ لاہور میں مسجد وزیر خاں کے پاس کاتب صحاف، اور درّاق بیٹھے رہتے تھے۔ یہ لوگ نہایت سجدت سے لوگوں کو حسبِ نسا کتابیں نقل کر دیتے تھے۔ اس حیثیت سے یہ بغداد کے سوق الموراقین سے مشابہت رکھتا تھا۔ باقی مسجد وزیر خاں نے اول روز سے اس کو اہل علم و فضل کا مرکز بنانے کی کوشش کی تھی۔ وصیت نامہ میں انہوں نے لکھا تھا:

”اس مسجد کا امام اور خطیب ایک ہی ہو جو بڑا خوش قرأت اور نماز کے احکام کا بڑا عالم ہو۔ نیز یہ شرط ہے کہ مشرقی دروازہ کے باہر ہیں دکانیں مع بالا خانوں کے اسلامی کتب کے صحافوں (جلد ساز، کتب فروش، جملہ کتب بیچنے والے) کے بیٹھنے کی یہ ہوں گی اور وہ ہمیشہ بے کرایہ بیٹھیں گے۔ نیز شرط یہ ہے کہ مسجد میں دینی علوم کی تعلیم کے لیے دو مدرس ہوں گے اور ان کو مذکورہ اوقاف میں سے حق الخدمت دیا جائے گا۔ امام اور خطیب کو ایک روپیہ سے دس روپیہ روزانہ تک، مؤذن کو چار آنہ یومیہ۔ ہر ایک مدرس کو ایک روپیہ۔ مرقومہ رمضان المبارک ۱۵۱۷ھ دو وقف نامہ مسجد وزیر خان۔ درج کتاب قانون وراثت از مولانا غلام دستگیر نامی ص ۱۲۴۰۔

اس وصیت نامہ کی وجہ سے اس مسجد میں علماء و فضلا شرعاً اور ادباً کا مجمع لگا رہتا تھا۔ خاص طور پر جمعہ کے روز یہاں مباحثے، مذاکرے، مناظرے اور مشاعرے منعقد ہوتے رہتے تھے۔

اس لحاظ سے یہاں جامع منصور بغداد اور جامع عمرو بن العاص قاہرہ کی روایا زندہ ہو گئیں۔ سکھوں کے عہد تک یہ علمی سرگرمی اس مسجد میں بدستور جاری رہی۔

پاکستان میں انگلہ یزی عہد کی قدیم لائبریری سکھر میں ہے۔ جہاں ڈران کمپنی (INDUS FLOATLA) کے میجر ہنری پوٹنجر (HENRY POTTENGER) نے ۱۸۲۹ء میں اس لائبریری کو قائم کیا تھا۔ ۱۸۶۹ء میں اس کو پبلک لائبریری بنا دیا گیا۔ اور عام لوگوں کے لیے کھول دیا گیا۔ آج بھی اس کو سکھر پبلک لائبریری کہتے ہیں۔

اس کے بعد پنجاب یونیورسٹی لائبریری قدیم ہے۔ یہ پاکستان کی عظیم لائبریری ہے۔ اس کا شرقی زبانوں کا حصہ تہایت قابل قدر ہے۔ حافظ محمود شیرانی اور پروفیسر شفیع کی کوششوں سے یہاں نادر کتب کا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ سندھ کی علمی تاریخ کے لیے علی شیر تابع کی کتاب تحفۃ الکرام ایک ناگزیر کتاب ہے۔ اس کا اصل نسخہ مصنف کا قلمی یہاں موجود ہے۔ علی شیر نوالی ہراتی کا مقام ترکی شاعری میں ایسا ہے جیسا کہ اردو میں غالب کا ہے۔ مگر ترکی دنیا میں اس کا دیوان مفقود ہے۔ وہ یہاں اس لائبریری میں رکھا ہوا ہے۔

اس کے بعد پنجاب پبلک لائبریری ہے۔ ۱۸۸۳ء میں اس کا آغاز ہوا ہے۔ اس کو علم دوست افراد اور افسروں کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ اس وجہ سے اس نے غیر معمولی انداز میں ترقی کی ہے۔ یہاں بھی کثیر کتب جمع ہیں۔ اس لائبریری کا شمار بصری کی چیدہ لائبریریوں میں ہوتا ہے۔ سرکاری مطبوعات سب یہاں موجود ہیں۔ یہ لائبریری اس علمی شہر کے شایانِ شان ہے۔

۲ احتیاط

ترجمان القرآن میں ضرورتِ استدلال کے لیے آیات و احادیث شائع ہوتی رہتی ہیں۔ قارئین سے گزارش ہے کہ جن اوراق پر آیات و احادیث ہوں۔ ان کا خاص احترام ملحوظ رکھیں تاکہ بے ادبی نہ ہونے پائے۔ (ادارہ)